محمد مشتاق احمد تجاروی

غالب اور قربان علی بیگ سالک

مرزا قربان علی بیگ سالک اردو کے ایک بڑے شاعر تھے۔ وہ مرزا غالب کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے آبا و اجداد طویل عرصے سے دہلی میں مقیم تھے۔ سالک کے والد عالم بیگ خاں اور چچا نیاز بہادر خاں تلاش روزگار میں حیدرآباد چلے گئے اور میر نظام علی خاں کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ عالم بیگ کی شادی حیدرآباد میں ہی عبدالرحیم خاں قلعہ دار گولکنڈہ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ (۱)

عالم بیگ خاں کے بڑے بھائی نیاز بہادر خاں چنچل گوڑہ کے ہنگامے میں شہید ہو گئے۔ (۲) بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس حادثے سے دل برداشتہ ہو کر عالم بیگ خاں نے بھی حیدرآباد کی سکونت ترک کر دی اور واپس دہلی آ گئے۔ اگر یہ درست ہو تو اس ترک سکونت کے فیصلے کو روبہ عمل آنے میں کم و بیش آٹھ سال لگے۔

قربان علی بیگ کی ولادت مالک رام کے مطابق ۱۸۲۴ء میں ہوئی۔ (۳) سراج الدین علی خاں نے ۱۸۱۶ء سے ۱۸۲۴ء کے درمیان قرار دیا۔ (۴) لیکن متعدد وجوہ کی بنا پر ۱۸۲۴ء زیادہ قرین قیاس ہے۔ جب سالک کی عمر تقریباً چھ سال تھی یعنی ۱۸۳۰ء میں عالم بیگ حیدرآباد چھوڑ کر دوبارہ دہلی آ گئے۔ (۵) سالک کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ کلب علی خاں فائق نے قیاساً لکھا ہے کہ سالک نے مدرسہ غازی الدین میں تعلیم حاصل کی ہوگی۔

سالک کی عمر ابھی گیارہ سال تھی کہ ۱۸۳۵ء میں والدہ کا انتقال ہو گیا، سالک نے اپنے بھائی شمشاد علی بیگ رضوان کے مرثیے میں اپنی اس محرومی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

کیا دارِ فنا میں ہم نے آ کر دیکھا　　آغاز سے انجام برابر دیکھا
ایامِ طفولیت میں ماں سے چھوٹے　　اب پیر ہوئے داغِ برادر دیکھا

سالک نے ابتدائی عمر میں ہی شعر گوئی شروع کر دی، مومن خاں مومن سے اصلاح لی۔ نواب مظفر حسین صبا نے لکھا ہے کہ پندرہ سال کی عمر میں شاعری کی اور مدتوں مومن خاں مومن کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ (۶)

سالک مرزا غالب کے پڑوسی تھے۔ ان کے اور مرزا کے مکان کے درمیان صرف میر خیراتی کا مکان تھا۔ (۷) جب کہ مومن کا گھر دور تھا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرزا کی بادہ خواری کی وجہ سے لوگ اپنے بچوں کو ان کی صحبت سے دور رکھتے تھے شاید اسی لیے سالک بھی پڑوس چھوڑ کر استاد کی تلاش میں دور گئے۔

سالک نے کچھ دن مومن سے اصلاح لی اس کے بعد غالب کی خدمت میں آ گئے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مومن کی وفات کے بعد سالک نے غالب سے تلمذ اختیار کیا تھا۔ خود سالک نے مومن سے تلمذ کو ''اقل روزگارے'' اور غالب سے استفادہ کو ''بیش تر زمانے'' لکھا ہے۔ (۸) کلب علی فائق نے اقل روزگارے سے مراد ۱۴ سال اور بیش تر سے مراد ۱۸ سال لیے ہیں۔ یعنی مومن کی وفات تک وہ ان کے شاگرد رہے اور پھر غالب سے رجوع کیا۔ (۹) لیکن حق یہ ہے کہ ریاضی کے اعتبار سے صحیح ہونے باوجود فائق کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ ریاضی میں اقل اور اکثر ایک ہندسے کے فرق سے بھی ثابت ہو جاتا ہے لیکن زبان کے خمِ کاکل میں اقل اور اکثر کا لفظ زیادہ فاصلے کا تقاضہ کرتا ہے اسی لیے مالک رام نے بھی اقل روزگار کو اس مفہوم میں نہیں لیا۔ ان کا خیال ہے کچھ مدت تک مومن سے استفادہ کیا پھر ان کی زندگی میں ہی غالب کی طرف رجوع ہو گئے۔ (۱۰) اور میر سراج الدین علی خاں نے اقل روزگار کو صرف چند سال میں ہی سمیٹ دیا اور لکھا ہے کہ قرائن کے مطابق ۱۸۴۰ء تک مومن سے اصلاح لی۔ (۱۱) سب کی اصل دلیل 'ہنجار سالک' کی عبارت ہے اس سے بہر حال اندازہ یہی ہوتا ہے کہ مومن سے تھوڑے عرصے ہی تلمذ رہا۔

غالب کے دربار میں پہنچ کر یہ پوری طرح اور سدا کے لیے ان کے مغلوب ہو گئے ساری عمر اسی دامن سے وابستہ رہے۔ مرزا غالب ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کے اشعار کی تعریف بھی کرتے تھے۔ ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

> ہائے پیش مصرع مرزا قربان علی بیگ سالک نے کیا خوب بہم پہنچایا ہے۔ مجھ کو پسند آیا:
>
> تنگدستی اگر نہ ہو سالک
> تندرستی ہزار نعمت ہے (۱۲)

عام طور پر لوگ اس شعر کو غالب کا شعر سمجھتے ہیں۔

غالب کے ایک شاگرد تفضّل حسین خان کوکب سے سالک کی گہری دوستی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے خواجہ تاش کہلاتے تھے اور اس حوالے سے پورے خاندان سے اچھا تعلق تھا جس کا اندازہ سالک کے دیوان میں موجود قطعات و قصائد سے بھی ہوتا ہے اور کوکب کے نام دو منظوم خطوط وغیرہ سے بھی ہوتا ہے۔

سالک ۱۸۵۷ء تک آرام سے دہلی میں رہے۔ یہ تو نہیں معلوم کہ روزگار کی سبیل کیا تھی۔ لیکن اچھی بسر ہوتی تھی کہ اچانک جنگِ آزادیٔ ۱۸۵۷ء شروع ہو گئی۔ سالک نے اس جنگ میں عملی حصہ لیا تھا۔ (۱۳) سعی انقلاب ناکام ہوئی اور دہلی کے دیگر شرفا کی طرح سالک کو بھی جاے پناہ کی تلاش ہوئی۔ دہلی سے نکل کر الور میں روپوشی اختیار کی۔ اس دورانیہ میں کوکب ان کو ہر طرح کی خبر رسانی کرتے رہے جب حالات کسی قدر معمول پر آ گئے اور دارو گیر کا خطرہ کم ہو گیا تو وہ واپس دہلی پہنچے۔

مالک رام نے لکھا ہے کہ بظاہر سالک جنگ آزادی میں شریک تھے اور ان کو اپنی گرفتاری کا خوف تھا اس لیے روپوش ہو گئے تھے۔ جب ان کو یقین ہو گیا کہ ان کا نام کسی طور انگریز حکام کے پیش نظر نہیں ہے تو الور سے واپس دہلی آ گئے۔ (۱۴)

دہلی میں معاش کا مسئلہ پیدا ہو گیا اس لیے نوکری کی جستجو ہوئی پہلی نظر انتخاب لوہارو پر پڑی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لوہارو جانے کا مشورہ خود غالب نے ہی دیا ہو اور پھر غالب نے اس سلسلے میں کوششیں کیں۔ سالک کے ایک بھائی شمشاد علی بیگ رضوان بھی تھے، ان کو بھی تلاش معاش کا مسئلہ درپیش تھا۔ مرزا غالب نے دونوں بھائیوں کے لیے لوہارو میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

غالب کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سالک لوہارو نہیں جانا چاہتے تھے۔ (۱۵) لیکن حالات سے مجبور ہو کر رضامند ہوئے اتفاق سے دونوں بھائیوں میں کوئی اختلاف ہوا، اس کے سلسلے میں غالب نے علائی کو خط لکھا:

> میرزا علائی پہلے استاد میر جان صاحب کے قہر و غضب سے مجھ کو بچاؤ تا کہ میرے حواس جو منتشر ہو گئے ہیں جمع ہو جائیں۔ میں اپنے کو کسی طرح کے قصور کا مورد نہیں جانتا، جھگڑا ان کی طرف سے ہے تم اس کو یوں چکاؤ یعنی اگر ان کو صرف آشنائی و ملاقات منظور ہے تو وہ میرے دوست ہیں شفیق ہیں میرا سلام قبول فرمائیں۔ اور اگر قرابت داری و رشتہ داری ملحوظ ہے تو وہ میرے بھائی ہیں مگر عمر میں چھوٹے میری دعا قبول فرمائیں۔ صاحبین کی رائے کا اختلاف مشہور ہے۔ مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا مگر ہر ایک قول جدا جدا

لکھوں۔ آج نہ لکھا نہ سہی دو چار دن کے بعد لکھوں گا۔ تم سمجھ تو گئے ہو گے کہ صاحبین مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ ہیں بھائی صاحب کی رضا جوئی مجھ کو منظور۔ اور یہ غزل معروض ہے میری طرف سے سلام کہو۔ (۱۶)

علائی دونوں بھائیوں کو لے جانے پر راضی تھے لیکن نواب امین الدین احمد خاں صرف رضوان کو اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند ہوئے۔ اس لیے غالب نے ایک خط میں لکھا:

صاحب میرا برادر عالی قدر اور تمھارا والد ماجد اب اچھا ہے از روے عقل اعادۂ مرض کا احتمال باقی نہیں ہے۔ رہا وہم اس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں۔ مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھو گے میری طرف سے وہی جواب ہو گا جو آگے لکھ چکا ہوں یعنی میں تماشائی محض رہوں گا۔ اگر بھائی صاحب مجھ سے کچھ ذکر کریں گے تو بھلی کہوں گا۔ (۱۷)

مالک رام نے لکھا ہے کہ نواب امین الدین احمد کو سالک کے سلسلے میں جو تامل تھا اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ جانتے تھے کہ سالک مجاہدین آزادی میں سے ہے، نہ جانے کب انگریزوں کی طرف سے عتاب کی صورت پیدا ہو جائے۔

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ لوہارو صرف مرزا شمشاد علی بیگ جائیں گے سالک نہیں۔ مرزا غالب کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے علائی کو لکھا:

کل مرزا شمشاد بیگ ناقل تھے کہ مجھ سے علی حسین خاں کہتے تھے کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ لوہارو چلو گے اور ہماری دال روٹی قبول کرو گے؟ میں نے کہا کہ میں دال روٹی چاہتا ہوں مگر پیٹ بھر کے۔ غالب کہتا ہے کہ اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ سالک سے سلوک منظور نہیں تنہائی ہوائے شمشاد در سر است:

رموز مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش (۱۸)

معاش کی ضرورت تو سالک کو بھی تھی۔ سالک پہلے الور میں رہ چکے تھے اور دہلی کے بہت سے باکمال

پہلے ہی الور کا رخ کر چکے تھے۔ اس لیے سالک نے بھی الور میں قسمت آزمانے کا ارادہ کیا اور ۱۸۶۳ء میں وہ الور میں وکیل مقرر ہو گئے۔ (۱۹) ظہیر دہلوی نے سالک کے ساتھ ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔

دوسال کے بعد سالک کے بھائی شمشاد علی خاں رضوان بھی الور آ گئے اور ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ (۲۰) یہ دونوں بھائی ۱۸۷۳ء تک فراغت کے ساتھ الور میں رہے۔

مرزا غالب سے اس دوران خطوط کے سہارے یاد و خیر رہتی تھی۔ ان کے نام مرزا کے دو خط موجود ہیں۔ ایک خط میں لکھا ہے:

> وللرحمٰن الطاف خفیہ۔ خیر و عافیت تمہاری معلوم ہوئی۔ دم غنیمت ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ کہتے ہیں خدا سے ناامیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے نا امید ہو کر کافر مطلق ہو گیا۔ موافقِ عقیدۂ اہلِ اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا نہ دین۔ مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو اور خدا سے نا امید نہ ہو۔ ان مع العسر یسراً کو اپنا نصب العین رکھو:
>
> در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست
>
> گھر میں تمھارے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ (۲۱)

سالک کے چچا کے انتقال پر مرزا غالب نے ان کو ایک تعزیت کا خط لکھا اس میں قلم کی بڑی ستم ظریفی ہے کہ انسان حالات و حادثات سے کس طرح نبرد آزما ہوتا ہے۔ خط یہ ہے:

> میری جان کن اوہام میں گرفتار ہے۔ جہاں باپ کو پیٹ چکا اب چچا کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے۔ اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں۔

چوں کہ یہ اپنے کو شاہِ قلمرو سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اُکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا، بے حیا، بے عزت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا۔[۲۲]

مرزا قربان علی بیگ الور میں اطمینان سے رہ رہے تھے لیکن الور کے حالات خراب ہو گئے۔ الور کے حالات میں تنزل کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سب سے اہم تو یہ کہ الور ریاست کو جن لوگوں نے ترقی کی بلندیوں پر پہنچایا تھا انگریزوں نے سازش کر کے ان کو الور سے نکلوا دیا اور ریاست پھر نااہل کارندوں کے ہاتھ میں چلی گئی، پھر خزانہ خالی ہو گیا اور ریاست قرض میں ڈوب گئی۔ لیکن اس دفعہ قرض کا معاملہ متھرا یا ریواڑی کے کسی لالہ کا نہ تھا بلکہ کمپنی بہادر سرکار انگریزی کا تھا۔ الور کے حالات کیا خراب ہوئے، بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ انگریز منتظر تھے ہی فوراً مداخلت کی اور ۱۸۷۳ء میں مہاراجہ کو بے دخل کر دیا۔ ان کے متوسلین کو برطرف کر دیا۔ اسی میں یہ دونوں بھائی بھی شکار ہوئے اور مجبوراً دہلی آ گئے۔

قربان علی بیگ سالک تو ۱۸۷۳ء میں حیدرآباد چلے گئے۔ ان کے ایک چچا 'رن بہادر' وہاں پہلے سے تھے اور سالک کی جاے پیدائش اور ننھیال حیدرآباد ہی تھا۔ ان کو جلد ہی وہاں محکمۂ تعلیمات میں اچھی ملازمت مل گئی اور وہاں کی اعلیٰ مجلسوں میں باریابی ہوگئی۔ خاص طور پر نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی ان پر خصوصی طور پر مہربان تھے۔ مرزا داغ دہلوی نے بھی میزبانی کا حق ادا کر دیا۔

حیدرآباد میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے مخزنِ فوائد کے نام سے ایک رسالے کا اجرا کیا تھا۔ یہ ایک ماہ نامہ تھا اور اس میں آغا مرزا دہلوی، محسن الملک، وغیرہ مضامین لکھتے تھے۔ اس رسالے کی ادارت سالک کے ذمے تھی اور سالک اس میں مضامین بھی لکھتے رہتے تھے، میر سراج الدین علی خاں نے سالک کے ایک بالاقساط مقالے اردوے معلّٰی کا تذکرہ کیا ہے جو انھوں نے اردو کی لسانیاتی تشکیل پر لکھا تھا۔[۲۳] اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ یہ اپنے موضوع کی ابتدائی تحریروں میں سے ایک ہے حتیٰ کہ محمد حسین آزاد کی آبِ حیات بھی اس سے مؤخر ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے حکیم محمود خاں کے ایک طبّی

رسالے لذت الوصل کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور اس ترجمے کا نام کارنامۂ عشرت رکھا۔[۲۴] سالک نے اردو و فارسی دونوں زبانوں میں دیوان مرتب کیا لیکن ان کا فارسی دیوان نہیں ملتا البتہ اشعار مل جاتے ہیں روزِ روشن کے لیے تو انھوں نے خود انتخاب کیا تھا اردو دیوان میں بھی متعدد فارسی قطعات ہیں۔

سالک بڑے شاعر تھے۔ ان کے متعدد تلامذہ دہلی اور حیدر آباد میں ہوئے۔ مرزا غالب کے بھی متعدد تلامذہ نے غالب کی وفات کے بعد ان سے اصلاح لی۔

حیدر آباد میں ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں سالک کی وفات ہوئی۔[۲۵] سالک کے بارے میں ایک اہم اطلاع یہ ہے کہ عالم اسلام کی نامور شخصیت اور جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سالک کے سگے نواسے تھے۔

سالک بڑے پُرگو شاعر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں میں ان کو یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کے معاصر اور بعد کے لوگوں نے ان کی قادرالکلامی کی بڑی تعریف کی ہے۔ ان کے لیے سب سے بڑی سند تو خود مرزا غالب کا اعتراف ہے جس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ دوسرے لوگوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے دہلی کا ایک یاد گار مشاعرہ میں لکھا ہے:

> بھلا کون سا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سنی جاتی اور کونسا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔[۲۶]

مولانا الطاف حسین حالی نے سالک کے دیوان اول ہنجار سالک کی تقریظ میں لکھا ہے:

> وہ سخن وری میں یکتا اور باک اصل بے مثال در یکتا ہیں، وہ شعلہ زبانی میں مثال اور شیوا بیانی میں مسلّم ہیں، وہ پاک راستوں کے راہرو، مرزا قربان علی بیگ سالک ہیں ان کا ذکرِ جمیل ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ آج وہ نکتہ آفرینی میں اور نکتہ بیانی میں استادوں کے استاد ہیں اور جہاں آباد (دہلی) ان کے مبارک وجود سے جہاں آباد ہے، سچ یہ ہے کہ اگر شاعری کو شراب تسلیم کر لیں تو ان کا کلام شاعری کے جامِ کا سرور ہے اور اگر شاعری کو فن تسلیم کر لیں تو سالک اس فن میں بے مثال استاد ہیں۔[۲۷]

لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ ''آپ کا کلام دلی کی شاعری کا قابلِ قدر نمونہ ہے، نغز گوئی، سلاست، بلاغت کی جان ہے۔ آپ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے اور معنی بندی میں بلند پایہ رکھتے تھے۔''[۲۸]

لالہ سری رام نے سالک کی شعری خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

نازک خیالی میں فرد، مضمون آفرینی میں بے نظیر تھے، فصاحت، بلاغت کلام کا قابل داد جوہر ہے، بندش کی نفاست اور صفائی اپنے ساتھ سوز و گداز کو لیے ہوئے ہے۔ آپ حسن و عشق کے رموز بیان کرنے میں انسانی فطرت پر گہری نگاہ ڈالتے تھے۔ معاملہ نگاری میں عامیانہ روش سے بچتے تھے۔ آپ نے عاشقانہ زندگی کے مقصد کو اپنی جدت پسند طبیعت کے سانچے میں ڈھال کر یوں بیان کیا ہے:

تم غیر کے ہوئے تو رہا کیا جہان میں
گویا ہمارے واسطے کچھ بھی بنا نہ تھا

حضرت سالک مبالغہ کے دشوار گزار میدان میں بھی شوخ بیانی کو مدنظر رکھتے تھے۔ طرزِ ادا سے شعر مزیدار ہو جاتا تھا۔ آپ نے اپنے گھر کو 'مایۂ آفات' قرار دیتے ہوئے اس مضمون کو عجیب طریقے سے بیان کیا ہے کہ جس فتنے کو میرے گھر کی راہ نہ ملی وہ شورش کدۂ قیامت میں داخل ہو گیا۔ فرماتے ہیں:

ناچار ہوا وادیٔ محشر کو روانہ
جس فتنہ نے پایا نہیں رستہ میرے گھر کا

اپنی پریشانی کو دنیا بھر کے آلام سے ترجیح دے کر انتہائی بلاغت پیدا کر دی:

ایک میری ہی پریشانیٔ قسمت لکھ کر
تہ کیا کاتبِ تقدیر نے دفتر اپنا

مضمون بے ثباتی پر ہر ایک مصور خیال نے اپنے نگارخانے میں ہنگامۂ ہستی کو ناپائیدار ٹھہرایا ہے۔ مگر آپ نے عاشقانہ رنگ میں ناپائیداری کے ثبوت میں جو دلیل قائم کی ہے اس میں اعلیٰ درجے کی تخئیل ہے۔

ذرا سی ہمت اے فریادِ گیتی سوز لازم ہے
عدو قائل نہیں ہے دہر کی ناپائیداری کا[۲۹]

قربان علی بیگ سالک اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ سات سو صفحات پر مشتمل ان کا دیوان موجود ہے اور

متداول ہے۔ مرزا غالب کے شاگرد اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نانا ہونے کی وجہ سے غیر معروف بھی نہیں ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ ابھی تک ان کی شاعری کا کوئی سنجیدہ مطالعہ راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا، اور نہ شعر و ادب کی دنیا میں ان کو وہ مقام ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ لالہ سری رام نے اختصار کے ساتھ ان کے چند شعری خصائص بیان کیے ہیں۔ اس لیے یہ طویل اقتباس نقل کیا، تاکہ ادب کے طالب علموں کو مستحضر رہے کہ سالک کی شہرت مرزا غالب کے تلمذ کی سحر آفرینی کے علاوہ خود ان کے ذاتی جوہر کی بھی رہین منت ہے۔

ذیل میں سالک کے اشعار منتخب کر کے درج کیے جاتے ہیں (۳۰) ان سے سالک کے مذاق سخن کی ایک جھلک قاری کے سامنے آجائے گی:

کس کا جلوہ نظر سے گزرا ہے　　کہ مجھے کچھ نظر نہیں آتا
ہوں شبِ وصل اس قدر بے خود　　بیمِ مرگِ سحر نہیں آتا
بے پردہ چلے آئے وہ تنہا میرے آگے　　تقدیر سے حیرت ہوئی پردہ میرے آگے
ہجومِ بلا ہائے ہجراں نہ پوچھ　　تجھے کیا جو کچھ ہوگیا ہوگیا
ہزار نالے زباں پہ لاتا ہزار محشر ابھی دکھاتا　　شب جدائی اگر نہ آتا خیال اس چشمِ سرمہ گیں کا
نہ لامکاں سے گرے نخل سدرہِ بجلی　　مجھے خیال ہے واں آشیاں بنانے کا
واں دخل وہم کا، نہ گزر ہے خیال کا　　اچھی جگہ ہے دل کو بھروسہ وصال کا
عشاق اس کے رہتے ہیں دنیا سے بے خبر　　آرام ایک نام ہے اس کے ملال کا
وقفہ ہے ایک دم کا ولادت سے مرگ تک　　گر سو برس بھی ہوں تو زمانہ ہے حال کا
سمجھا ہوا ہے کنگرۂ عرش تو جسے　　غافل یہ ایک گوشہ ہے اس کی کلاہ کا
سالک صنم کدے سے نکالے گئے کہیں　　حضرت ارادہ رکھتے ہو کیوں خانقاہ کا
محشرِ غدر سے بھی مٹ نہ سکا اس کا وجود　　ہے الگ عالمِ فانی سے جہانِ دہلی
اعتبار نگہِ ناز ہے کیا کیا ان کو　　قتل کو آتے ہیں اور ہاتھ میں شمشیر نہیں
ایک مدت سے نہیں میں آپ میں　　آپ نے بھی کچھ خبر پائی مری
اچھی نبھی بتانِ ستم آشنا کے ساتھ　　اب بعدِ مرگ دیکھیے کیا ہو خدا کے ساتھ
خدا پر کام اپنا چھوڑ سالک　　نہ رہ اندیشۂ سود و زیاں میں
ہے ان دنوں میں گردشِ چشمِ بتاں کا دور　　تیرا زمانہ گردشِ دوراں گزر گیا

جو کچھ ہے اس کی بزم میں سب دل پہ نقش ہے
الفت نے کر دیا اسے عالم مثال کا

وہ دلکش ہے صورت کہ اس ظلم پر
زمانہ ترا مبتلا ہو گیا

تیرا چپ چپ یہ بیٹھنا سالکؔ
اک طرح کا بیان ہے گویا

بہت دور پہنچیں نگاہیں ولے
وہ پردے میں اب بھی نہاں رہ گیا

فرہاد مرکے عشق کو دھبہ لگا گیا
کچھ خود کشی طریقۂ اہل وفا نہ تھا

حسرتِ مردہ کو دم بھر میں جلا لیتا ہوں
آپ کیا مجھ کو بھی دعویٰ ہے مسیحائی کا

مانا کہ لب سے مہرِ خموشی اٹھائیں ہم
دے گا جواب کون ہمارے سوال کا

نکالے جا چکے ہیں سیکڑوں اس بات پر سالک
نہ لینا نام اس کے کوچے میں مطلب برآری کا

ماجرائے اشک خونیں کب ہوا سالک رقم
باندھ دی بازوے مرغِ نامہ بر سے آستیں

بنائیں آدمی اس خاک سے تو حال ظاہر ہو
کہ کیا کیا حسرتیں مٹّی ہوئی ہیں کوے جاناں میں

سر لگا ہے ان کے قدموں سے مرا حیران ہوں
اپنے سجدے کا نشاں یا ان کا نقش پا کہوں

وسعت آباد دل مشتاقِ وصلِ یار کو
آرزو کا یک جہاں، امید کی دنیا کہوں

جب تھک کے تری راہ میں بیٹھے تو کھلا حال
جو کھوئے گئے ہیں وہی کچھ پائے ہوئے ہیں

بدگماں مرگ سے ہے چارۂ حرماں مطلب
ہوسِ خلد نہیں آرزوے حور نہیں

کٹ گئی عمر یونہی حضرتِ ناصح افسوس
ہم سنا کرتے ہیں اور آپ کہا کرتے ہیں

جامِ نشاط بھرتے ہیں اور یہ خبر نہیں
پیمانۂ حیات بھی ہے کچھ بھرا ہوا

چاہیے اتنا تو چشمِ مست ساقی کا اثر
ہاتھ سے اس کے لیا جائے نہ ساغر ہاتھ میں

پھرتے ہیں داد خواہ ترے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں

کہنے کا غیر کے تو کسی کو یقیں نہیں
پر تیری آنکھ، راز کی تیرے امیں نہیں

تو ہمارے ساتھ ہے ہر حال میں
ہم کو خلوت میں بھی تنہائی نہیں

بند تھیں آنکھیں تو کچھ پروا نہ تھی
کھل گئیں آنکھیں تو بینائی نہیں

جتنی آہیں لب سے نکلیں اس قدر مطلب نہ تھے
میں نے کیا اظہارِ دردِ ہجر میں تقریر کی

سالک اگر ہے سانس تو باقی ہے آس بھی
مایوس نہ ہو رحمتِ پروردگار سے

ہنسو بولو کھلے خوبی زباں کی
خموشی بات کھوتی ہے دہاں کی

پروانے جل کے خاک ہوئے شمع رو چکی تاثیر حسن و عشق جو ہونا تھی ہو چکی

سالک نے شخصی مرثیے بھی بہت معیاری کہے ہیں۔ تفضّل حسین خاں کوکب کے مرثیے کے چند اشعار یہ ہیں:(۳۱)

رکھتا نہیں ثبات چمن روزگار کا کِھلتا نہیں ہے پھول یہاں اعتبار کا
ہیں فوج فوج درد و الم درپئے نشاط رنجِ خزاں نتیجہ ہے فصل بہار کا
وہ لوگ جن سے رونقِ ہر بارگاہ تھی اب دیکھیے چراغ بھی گل ہے مزار کا
خالی کیا ہے کس نے یہ بزمِ جہاں کو آج بگڑا ہوا مزہ ہے مئے خوش گوار کا
روتا ہوں زار زار تفضّل حسین خاں ہے لب پہ بار بار تفضّل حسین خاں
وہ کوکبِ سپہرِ محبت کہاں گیا وہ آفتابِ برجِ صداقت کہاں گیا
تھا اس کی ذات ہی سے شرف کائنات کو وہ فخرِ دودمانِ شرافت کہاں گیا
ماتم میں اس کے روئیے اب کس کے سامنے وہ سامعِ بیانِ مصیبت کہاں گیا
خورشید جلوہ گر ہے مگر دن سیاہ ہے بے نور ساز چشمِ بصیرت کہاں گیا
بستاں سرائے دل پہ چلی کیوں سمومِ غم وہ نخلِ ہند گلشنِ الفت کہاں گیا
اب صحبتِ ثبوتِ وجودِ وفا کہاں تھا تیرے ساتھ شیوۂ مہر و وفا ترا
کرنا تھا چند روز تماشا یہاں کا اور کیوں سیر گاہِ دہر سے جی بھر گیا ترا

اپنے بھائی شمشاد علی بیگ رضوان کی وفات پر نہایت اثر انگیز مرثیہ لکھا تھا اس کے چند اشعار یہ ہیں:(۳۲)

فرقِ جواں و پیر نہیں روزگار کو بھائی کو موت آئی رہا میں بچا ہوا
وہ بھائی جس پہ جانِ گرامی نثار ہو وہ بھائی جس کا صدمۂ غم بار بار ہو
آنکھیں یہ ڈھونڈتی ہیں کہ رضواں کدھر گیا وہ مایۂ سرورِ دل و جاں کدھر گیا
حفظِ خدا پہ چھوڑ کے اہل و عیال کو اے میرے سارے گھر کے نگہباں کدھر گیا

سالک نے مہاراجہ شیودان سنگھ کی مدح میں بہت سی نظمیں اور کئی قصیدے لکھے۔ ایک قصیدہ بڑا مرصع اور اعلیٰ ادبی معیار کا ہے اس لیے اس قصیدے کو پورا نقل کیا جاتا ہے:(۳۳)

قطعۂ تاریخ بہ جشنِ مسند نشینیٔ مہاراؤ راجہ شِودان سنگھ [شیودھیان سنگھ] بہادر والیٔ الور

وہ سلیماں مرتبت شِودان سنگھ آقا مرے حاتمِ دوراں اگر ان کو کہوں تو ہے بجا
غیب سے ملتی ہے یوں ہر کام میں ان کو مدد ماہ کو خورشید سے جس طرح حاصل ہو ضیا

آج وہ حق نے دکھایا ہے خوشی کا دن انھیں
عمر بھر جمشید نے آنکھوں سے جو دیکھا نہ تھا

کس قدر ہے خرّمی افزا گلستانِ مراد
کس قدر شیریں ثمر لایا نہالِ مدعا

نور آگیں ہو گئی شمعِ شبستانِ جلال
بزمِ رنگیں بن گیا ہر گوشۂ دولت سرا

یعنی فرزندِ سعادت مند نے پایا ظہور
دی مبارک باد کی بختِ ہمایوں نے صدا

خضر نے گرچہ حیاتِ جاودانی نذر کی
پیشکش لایا سکندر طالعِ بخت و رسا

طالبِ انعام رقّاصِ فلک ہے بعدِ رقص
مشتری نے دی سعادت، ماہ بولا مرحبا

نغمہ سنجِ تہنیت اہل زمیں کو دیکھ کر
عالمِ بالا سے قدسی کہہ رہے ہیں حبّذا

ہو رہی ہے اس خوشی میں زر فشانی اس قدر
بن گئی ہیں سائلوں کی جھولیاں کانِ طلا

میں نے چاہا سنّت و تاریخِ ہجری ہو رقم
دیکھ کر حیراں سروشِ غیب نے مجھ سے کہا

ہے مبارک بزمِ جشنِ فرّخی سرکار کو (۳۴)
سنّت اس کا یہ ہے اب ہجری کا دوں تجھ کو پتا

۱۹۲۶ء

دیکھ بزم و جشنِ عشرت خیر کے آغاز کو
فیضِ و لطف و مکرمت کی پھر نظر کر انتہا

+۳+۲
۸۰۰+۸۰+۴۰۰=۱۲۸۰ھ

سن کے تاریخیں کیا میں نے ادا اس کا سپاس
ہاتھ اٹھائے اپنے آقا کے لیے بہرِ دعا

تا رہیں دنیا میں عیش وعشرت و لطف و سرور
نا رہیں گیتی میں درد و کلفت و رنج و بلا

عیش وعشرت سے رہیں احباب ان کے شادکام
درد و کلفت میں رہیں بد خواہ ان کے مبتلا

حواشی

۱۔ میر سراج الدین علی خاں، ذکر سالک، (حیدر آباد:۱۹۷۹ء)، ص ۲۱
۲۔ ایضاً، ص ۲۰
۳۔ مالک رام، تلامذۂ غالب، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۴ء)، ص ۲۳۸ [طبع دوم]
۴۔ میر سراج الدین علی خاں، ذکر سالک، محولۂ بالا، ص ۲۱
۵۔ مظفر حسین صبا، تذکرہ روز روشن، تصحیح و تحشیہ محمد حسین رکن زادۂ آدمیت، (طہران: کتاب خانہ رازی، ۱۳۴۳ شمسی)، ص ۶۵۵
۶۔ ایضاً، ص ۶۵۵
۷۔ مرزا غالب، غالب کے خطوط، جلد ۲، مرتبہ خلیق انجم، (دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء)، ص ۴۹۴
۸۔ مرزا قربان علی بیگ سالک، ہنجار سالک، (دہلی: مطبع بدرالدجیٰ، ۱۸۷۱ء)، ص ۷۔۸

۹۔ ایضاً، کلیاتِ سالک، مرتبہ کلب علی خاں فائق، (لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۶۶ء)، ص ۸
۱۰۔ مالک رام، تلامذۂ غالب، محولۂ بالا، ص ۲۴۲
۱۱۔ ذکر سالک، محولۂ بالا، ص ۲۲
۱۲۔ مرزا غالب، غالب کے خطوط، جلد ۲، مرتبہ خلیق انجم، محولۂ بالا، ص ۵۳۷
۱۳۔ مالک رام، تلامذۂ غالب، محولۂ بالا، ص ۲۳۹
۱۴۔ ایضاً
۱۵۔ غالب کے خطوط، جلد ۱، مرتبہ خلیق انجم، محولۂ بالا، ص ۴۰۰
۱۶۔ ایضاً، جلد ۱، ص ۳۸۰
۱۷۔ ایضاً، جلد ۱، ص ۳۸۵
۱۸۔ ایضاً، جلد ۱، ص ۳۸۱
۱۹۔ مالک رام، تلامذۂ غالب، محولۂ بالا، ص ۲۴۰
۲۰۔ ایضاً
۲۱۔ غالب کے خطوط، جلد ۲، مرتبہ خلیق انجم، محولۂ بالا، ص ۸۱۹
۲۲۔ ایضاً
۲۳۔ میر سراج الدین علی خاں، ذکر سالک، محولۂ بالا، ص ۳۲
۲۴۔ جمیل جالبی، تاریخ ادبِ اردو، جلد چہارم، حصہ اوّل، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۶ء)، ص ۴۶۹، [طبع سوم]
۲۵۔ مالک رام، تلامذۂ غالب، ص ۲۴۲
۲۶۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، تنقید و تبصرہ احسان الحق اختر، (لاہور: ادبی لائبریری، ۱۹۶۸ء)، ص ۱۲۶
۲۷۔ ہنجار سالک، محولۂ بالا، ص ۵
۲۸۔ خمخانۂ جاوید، جلد ۴، (دہلی: ہمدرد پریس، ۱۹۲۶ء)، ص ۳۹
۲۹۔ ایضاً، جلد ۴، ص ۳۸
۳۰۔ اس ضمن میں دیگر مآخذ کے علاوہ کلیاتِ سالک، مرتبہ کلب علی خاں فائق، (لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۶۶ء) بھی پیشِ نظر رہی ہے۔
۳۱۔ ایضاً، ص ۵۸۲۔۵۸۱
۳۲۔ ایضاً، ص ۵۹۳۔ ۵۹۲
۳۳۔ ایضاً، ص ۶۶۶۔ ۶۶۴
۳۴۔ مرتّب کلب علی خاں فائق کے مطابق اصل متن میں ۱۹۲۶ء ہی درج ہے لیکن اس میں تخرجہ نہیں ہے اور درست اعداد بھی پورے نہیں ہیں۔ دیکھیے: کلیاتِ سالک، محولۂ بالا، حاشیہ ص ۶۶۵

مآخذ

۱۔ بیگ، مرزا فرحت اللہ، دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، تنقید و تبصرہ احسان الحق اختر، لاہور: ادبی لائبریری، ۱۹۶۸ء۔

۲۔ جالبی، جمیل، تاریخ ادب اردو (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۶ء)، طبع سوم، جلد چہارم، حصہ اول۔
۳۔ رام، مالک، تلامذۂ غالب، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۴ء، طبع دوم۔
۴۔ سالک، مرزا قربان علی بیگ، ہنجار سالک، دہلی: مطبع بدرالدجیٰ، ۱۸۷۱ء۔
۵۔ سری رام، لالہ، خمخانۂ جاوید، جلد ۴، دہلی: ہمدرد پریس، ۱۹۲۶ء۔
۶۔ صبا، مظفر حسین، تذکرہ روز روشن، تصحیح و تحشیہ محمد حسین رکن زادۂ آدمیت، طہران: کتاب خانہ رازی، ۱۳۴۳ شمسی۔
۷۔ غالب، مرزا، غالب کے خطوط، جلد ۱، مرتبہ خلیق انجم، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء۔
۸۔ _____، غالب کے خطوط، جلد ۲، مرتبہ خلیق انجم، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء۔
۹۔ مرزا قربان علی بیگ سالک، کلیاتِ سالک، مرتبہ کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۶۶ء۔
۱۰۔ میر، سراج الدین علی خاں، ذکرِ سالک، حیدرآباد: ۱۹۷۹ء۔